احمد بشیر کی آپ بیتی ''دل بھٹکے گا'' میں ہجرت و فسادات کی عکاسی

امتیاز گل[1]،

پروفیسر ڈاکٹر سلمان علی[2]

ABSTRACT:

The impact of independence and partition of Subcontinent India (1947) is profound on canon of contemporary texts. Autobiography of renowned Urdu writer, journalist, intellectual and film director Ahmad Bashir [1923-2004] *"Dil Bhatkay Ga"* [The heart has to stray] stands out as an important document in this context. The personal narrative and analysis of incidents related to partition in his work confirms many other narratives on the subject, while refute some of them. Ahmad Bashir captures the mental agony faced by people as establishing a new and independent country requiring migration, and this resulted in experiencing brutal violence and bloodshed. The text records savage silence of the elites and its impacts on personal and social psychology. This article study and analyzes the depiction of migration and riots portrayed in the autobiography of Ahmad Bashir. Additionally, an attempt is made to analyze stylistic peculiarities related to portrayal of migration during the partition.

Key words: Partition of India; 1947; Literature and Politics; Riots Depiction

کوئی بھی تخلیق کار جب تخلیقی عمل سے گزرتا ہے تو وہ اپنے جذبات و احساسات کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے تجربات اور مشاہدات کو بھی زیرِ بحث لاتا ہے۔ اسی طرح کوئی بھی فن پارہ اپنے لکھنے والے کی زندگی اور اُن کی نفسیات کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ اس ضمن میں ایک قسم اُن تخلیقی فن پاروں کا ہوتا ہے جس میں مصنف اپنے تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر معاشرے سے متعلق افراد کو فرضی کردار کے طور پر پیش کرتا ہے۔ دوسری قسم اُن فن پاروں کا ہے جس میں مصنف بذاتِ خود ایک اہم اور مرکزی کردار کے طور پر موجود ہوتا ہے۔ مؤخر الذکر میں سب سے اہم آپ بیتی کی

---

[1] ۔ پی ایچ ڈی اسکالر، شعبۂ اُردو جامعہ پشاور

[2] ۔ شعبۂ اُردو جامعہ پشاور

صنف ہے جس میں مصنف نہ صرف اپنے تجربات ومشاہدات کا تذکرہ کرتا ہے بلکہ اُن کی زندگی میں جتنے بھی چھوٹے بڑے واقعات اور حادثات پیش آئے ہیں اُن کا تذکرہ اس انداز سے کیا جاتا ہے کہ ان کی اپنی شخصیت بھی کھل کر سامنے آتی ہے اور اُن کا نقطۂ نظر بھی کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ اُردو آپ بیتی کے ارتقائی سفر کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ابتدا سے لے کر دورِ حاضر تک جتنی بھی آپ بیتیاں لکھی جاچکی ہیں اُن میں اپنے دور کے چھوٹے بڑے واقعات کو بیان کیا جاچکا ہے۔ اس ضمن میں تقسیمِ ہند ایک ایسا واقعہ ہے جس نے نہ صرف فرد کی ذاتی زندگی کو متاثر کیا بلکہ اُن سے جڑے پورے معاشرے پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

ہندوستان اقوامِ عالم کے لیے ہمیشہ ایک اہم خطہ رہا ہے تقریباً یہی وجہ ہے کہ آغاز سے مختلف اقوام نے اس خطہ زمین کو اپنے قبضے میں رکھا اور یہاں رہنے کو ترجیح دی ہے۔ اس میں بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں کی سرزمین زرخیز اور آب وہوا معتدل ہے۔ موسمی تغیرات بھی شدید نہیں، اس لیے مختلف نسلوں اور قوموں نے جب یہاں کا رخ کیا تو یہاں کے ہو گئے۔ لیکن صرف انگریز جو سب سے آخر میں آئے ان کے مقاصد کچھ اور تھے اور وہ یہاں سے واپس چلے تو گئے لیکن یہاں کی تہذیب میں مدغم ہو چکے ہیں اس لیے جواہر لعل نہرو نے کہا کہ "ہم نسلوں کے معجون مرکب سے تعلق رکھتے ہیں اور ہمارا سلسلہ انسانی تاریخ کے آغاز تک پہنچتا ہے"(۱)

۱۹۴۷ء کے بعد لکھی جانے والی آپ بیتیوں میں مجموعی طور پر تقسیمِ ہند کا واقعہ ایک بڑے سانحے کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اُس دور سے تعلق رکھنے والے ادبا نے ہجرت و فسادات کے مناظر خود اپنی آنکھوں سے دیکھے، محسوس کیے اور بعض نے تو خود ان حالات کا سامنا کیا۔ اسی طرح جب انہوں نے اپنی داستانِ حیات رقم کرنا چاہی تو بطورِ خاص اس واقعے اور ان کے متعلقات (ہجرت، فسادات، قتل وغارت گری، بے حسی) کو بھی بڑی باریک بینی سے پیش کیا ہے۔ اس حوالے سے اگر دیکھا جائے تو احمد بشیر کی آپ بیتی "دل بھٹکے گا" ایک اہم تصنیف ہے جس میں انہوں نے نہ صرف اپنی زندگی کی داستان رقم کی ہے بلکہ ہجرت وفسادات کے تمام مناظر بھی جگہ جگہ پر دکھائی دیتے ہیں۔

اس آپ بیتی میں احمد بشیر کے بچپن سے لے کر اخیر عمر تک کے حالات وواقعات کا ترتیب وار احاطہ کیا گیا ہے۔ یہاں پر وہ رومانوی، تحیر آمیز اور افسانوی کرداروں کا سہارا لے کر تخلیق نہیں کرتے بلکہ سیدھے سادے اور سپاٹ جملے ان کی زندگی اور واقعات کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ اس حوالے سے دیباچہ میں وہ خود لکھتے ہیں کہ:

"میں نے "دل بھٹکے گا" میں جذبات نگاری نہیں کی لیکن بعض اوقات لکھتے

لکھتے میں خود رو پڑا۔ میں رقیق القلب آدمی نہیں ہوں، مگر تقسیمِ ہند کے زمانے میں جن وارداتوں سے میں گزرا، ان کے بیان میں اگر میری آنکھیں گیلی ہوئی تو مجبوری نہیں۔ یہ عرض کر دوں کہ میں مہاجر نہیں ہوں، میرا کوئی رشتہ دار بھی کسی مصیبت میں نہیں پڑا مگر پھر بھی ہم سب آدھے دھڑکے رہ گئے۔"(۲)

صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ ان کی حالاتِ زندگی اور رودادِ زمانہ ہے جو ان پر گزرے ہیں جن سے متعلق وہ کچھ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ:

"میں نے اس ناول میں بعض کرداروں کے اصلی نام بھی لکھ دیے۔ وہ اتنے عظیم تھے کہ میں ان کو فکشن میں تخلیق نہ کر سکتا تھا۔ یہ میری سچائی ہے یا بد معاشی۔ میں شرفا کو گلی بازاروں میں لے آیا اور بعض کی کمینگیاں، بے وفائیاں اور منافقتیں بھی میں نے بیان کر دیں۔ مگر ایسوں کے اصلی نام میں نے نہیں لکھے کیونکہ میں ان سے نفرت نہیں کرتا۔"(۳)

یہ ایک ضخیم آپ بیتی ہے جسے ۳۹ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو پہلی مرتبہ فیروز سنز نے ۲۰۰۳ء میں اور سنگِ میل پبلی کیشنز نے ۲۰۱۲ء میں شائع کیا ہے۔ جو ۸۹۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے متعلق ڈاکٹر اشرف کمال لکھتے ہیں کہ:

"احمد بشیر ایک تخلیق کار ہے اسی لیے انہوں نے اس آپ بیتی کو ناول کی طرز پر ایک خوبصورت قصہ بنانے کی کوشش کی ہے تاکہ قارئین دلچسپی کے ساتھ اسے پڑھ سکیں۔ اس کی کہانی گاؤں سے شروع ہوتی ہے جہاں اس کی پیدائش بچپن کے واقعات اور معاشی صورتِ حال کو بیان کیا گیا۔"(۴)

اس آپ بیتی میں انہوں نے خود کو جمال کے نام سے پیش کیا ہے جو ایک سکول میں داخلہ لیتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ باقی زندگی کا احاطہ کر لیا گیا ہے۔ انہوں نے ہندوستانی تہذیب و ثقافت اور معاشرتی اقدار کو خاص طور پر مدِ نظر رکھا ہے۔ انہوں نے انگریزوں کے دورِ اقتدار میں انگریزی غلامی کو نفرت بھری نظروں سے دیکھا ہے۔ اس دوران ان کے سامنے

جو واقعات ہوئے اس میں ایک دفعہ خواجہ یٰسین کے متعلق لکھتے ہیں:

"جمال نے باقاعدہ سکول جانا نور پور میں شروع کیا تھا کیونکہ خواجہ یٰسین نے انگریز کی نوکری چھوڑ دی تھی۔ اس کی وجہ سیاسی نہیں تھی وہ انگریز کو پسند بھی نہیں کرتا تھا مگر یہ تصور اس کے لیے محال تھا کہ انگریز ہندوستان چھوڑ کر چلا جائے گا۔ انگریز کی مخالفت ایک خطرناک بات تھی اس میں لمبی قید اور پولیس کی مار پیٹ کے سوا کسی کو کچھ حاصل نہ ہوا تھا۔ ایک دن انہوں نے لاٹ صاحب کے دفتر سے استعفیٰ دے دیا جہاں وہ کلرک تھے کہا میں نہیں کرتا انگریز کی نوکری۔"(۵)

یہاں پر کلرک اور نوکری سے انہیں نفرت سی معلوم ہوتی ہے کہ یہ دونوں انگریزی غلامی کی نشانیاں ہیں۔ لارڈ میکالے نے کہا تھا کہ میں ایسا ہندوستانی نسل تیار کروں گا جو جسمانی طور پر ہندوستانی اور ذہنی طور پر انگریز ہو گا۔ انگریزوں نے ہندوستانیوں کو تعلیم کے زیور سے نوازا لیکن اسی تعلیم یافتہ طبقے نے ہی ان سے آزادی حاصل کی۔ جنہیں اصل میں وہ اپنا غلام بنانا چاہتے تھے۔ البتہ یہ بات بھی صحیح ہے کہ ہم ابھی تک ان کی طرزِ زندگی گزارنے کو بہتر، ہندوستانی اور مشرقی چیزوں کو ان سے کمتر سمجھتے ہیں۔ انگریزی زبان کو فخر کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ تمام چیزیں نارمل ہیں جن میں برتری کی کوئی بات نہیں ہے۔

بالا پیراگراف میں احمد بشیر نے خواجہ یٰسین کے توسط سے انگریزوں کی نوکری سے نفرت کا اظہار کیا ہے تو اس پر بس نہیں بلکہ دوسرے کرداروں کے ذریعے بھی انہوں نے نفرت ظاہر کی ہے۔ ایک مرتبہ شاہ معظم جارج پنجم برطانیہ قیصر ہند کی تخت نشینی کی سلور جوبلی کی تقریب کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کچھ یوں کیا ہے۔

"سلور جوبلی کے انتظامات میں شہر کے سبھی معززین شامل ہوئے۔ کیا ہندو کیا مسلمان مگر ایک وساکھا سنگھ تھا جو اس روز شراب پینے کے لیے بھی گھر سے نہ نکلا۔ اپنے پوتے جوگندر سنگھ کو اس نے گلابی پگڑی رنگوادی تھی کیونکہ یہ اسلامیہ سکول کے ہیڈماسٹر کا حکم تھا مگر خود اسے سلور جوبلی کی کوئی پرواہ نہ تھی۔"(۶)

انہوں نے وساکھا سنگھ کی حیثیت سے شدید نفرت کا اظہار کیا ہے لیکن وہ اکیلے ہیں اور قوت نہیں رکھتے اس کا اپنے پر بس چلتا ہے تو انہوں نے انگریزوں کی شکل تک دیکھنا گوارا نہیں کیا لیکن ان کے علاوہ تمام ہندو اور مسلمان جو اس علاقے میں موجود تھے جو غلام ذہنیت کے مالک تھے۔ انہوں نے اس محفل میں شرکت اپنے لیے باعث فخر سمجھا۔ ایک تانگے والا یہاں سے گزر رہا تھا جس کے گھوڑے نے لید کی جس کی وجہ سے وہاں کے انتظامیہ کو غصہ آیا اور اس تانگے والے کو حکم دیا کہ اب اس گندگی کو ہاتھوں سے صاف کرو اور زبردستی ان سے جگہ صاف کروایا۔ جس پر ان کے درمیان تکرار ہوئی کیونکہ وہ گھوڑے کی اس حرکت کو جارج پنجم کی شان میں گستاخی سمجھ رہے تھے۔

سکول کی زندگی سے آگے بڑھے تو ان کے خیالات پاکستان اور مسلم لیگ کی حمایت کرتے نظر آتے ہیں۔ فوج میں ایک مرتبہ دربار خان نے انہیں اپنے پاس بلایا اور کچھ باتیں کی وہ ایک اعلیٰ افسر تھے اور یہ دوسری جنگِ عظیم کا دور ہے جس میں دربار خان نہایت چابک دستی کے ساتھ مختلف کام انجام دے رہے ہیں۔ دربار خان ایک پروفیشنل آفیسر ہے اور جمال ایک عام سپاہی یا چوکیدار جنہیں وہ باہر بیٹھنے کے دوران سیاسی باتیں سننے سے منع کرتا ہے اور خود کو سیاسی باتیں کرنے کا حقدار اور ذمہ دار سمجھتا ہے جس سے ہمارے ملک کے فورسز کی ترجمانی بھی ہوتی ہے۔ وہ جمال سے کچھ یوں مخاطب ہوتا ہے:

"ہماری سیاسی باتیں ہوتی ہیں اور سیاسی باتیں سننا وار (war) ڈیپارٹمنٹ کے ریگولیشنز کے خلاف ہے جانتے ہو۔

جی ہاں۔ جمال منمنایا۔

انڈین آرمی کے افسروں کو بھی سیاسی باتیں کرنے کی اجازت نہیں۔ سوائے ان کے جو پروفیشنل ہوتے ہیں۔

جی ہاں۔ جمال نے اتفاق کیا۔

جانتے ہو کہ میں انڈین آرمی کا پروفیشنل افسر ہوں۔

جی ہاں۔

"کیا تم مسلم لیگی ہو؟"

"جی؟ جی ہاں"۔ جمال کے منہ سے نکل گیا۔ حالانکہ اس نے کبھی سوچا نہ تھا۔

''تمہارے خیال میں پاکستان بن جائے گا؟''

''جی ہاں۔''

کبھی نہیں دربار خان میز پر ہاتھ مار کر بولا۔ ''انگریز کا سورج کبھی غروب نہیں ہو گا۔ وہ ہندوستان چھوڑ کر نہیں جائے گا اور کیوں جائے گا؟''

''جی''

تم اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔ جنگ کے بعد بھوکے مرو گے کبھی سوچا تم نے؟

''جی نہیں۔''

۔۔۔۔۔ تمہاری سلامتی اسی میں ہے۔ ''چلو اب جاؤ''۔ اس نے چٹکی بجا کر جمال کو کمرے سے نکال دیا۔''(۷)

آگے چل کر وہ اس تصنیف میں پاکستان اور فسادات کے متعلق جو انکشافات کرتے ہیں اور جن حالات کا تذکرہ کرتے ہیں تو دل خون کے آنسو روتا ہے، رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ تقسیم ہند کے وقت اس زمین کو اس طرح کی صورتِ حال بھی پیش آئی ہے۔ اس وقت جو لوگ زندہ رہے اور فسادات کا نظارہ کیا وہ بعد میں زندوں میں شمار ہو سکتے تھے؟ یہ جو لوگ درندگی پر اُتر آئے تھے کیا یہ بھی ہندوستانی تھے؟ کیا سکھ کیا مسلمان اور کیا ہندو۔ کیا یہ سب انسان بھی تھے جن سے یہ اجتماعی قتل عام سرزد ہو سکتا تھا؟ یہ اس طرح کے حالات و واقعات اس تصنیف میں دیکھنے کو ملتے ہیں جس کے متعلق پروفیسر ڈاکٹر پرویز پروازی یوں لکھتے ہیں:

''تحریک پاکستان کے عوامل ۱۹۴۷ء کا قیامت خیز قتلِ عام، قیام پاکستان کے بعد بنیاد پرستوں کی اسے اسلامی ریاست بنانے کی سازش، کمیونزم اور سوشلزم کی باتیں، قیام پاکستان کے ابتدائی دور سے لے کر مشرقی پاکستان کی علیحدگی تک کے سیاسی حالات، بھٹو کے سوشلزم کی ناکامی اور پھر ضیاء الحق کے دور کا لمبا ابتلا۔''(۸)

احمد بشیر پیشے کے لحاظ سے ایک صحافی تھے جو امریکہ میں فلم انڈسٹری اور ریڈیو وغیرہ کے متعلق تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔ لیکن ان کو اس شعبے میں مسلسل ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ وہ نہایت صاف گو یا یوں کہیے کہ سب رازوں کو برملا کہنے

اور کسی پر پردہ نہ رکھنے کی خو رکھتے ہیں۔ آپ نے اپنے دوستوں کی بیویوں کو بھی نہیں بخشا۔ جب انہوں نے اپنی آپ بیتی لکھنے کی جسارت کی تو بہت سے لوگوں کو خوف لاحق تھا لیکن اس کے لیے انہوں نے خلافِ توقع بندوبست کر رکھا تھا اور خود سمیت دیگر کچھ کرداروں کو بھی فرضی کرداروں کی صورت میں پیش کیا۔ جن کے توسط سے انہوں نے تمام کمیونٹیز کی صحیح حال اور کارکردگی بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں وہ مسلمانوں کو ہندو اور ہندو کو مسلمان پر ظلم کرتے دکھائی دیتے ہیں تو سکھ کو بھی اصلی حالت میں سامنے لاتے ہیں اور ان سب کو انگریزوں نے ایک طرح سے آزادی دی ہے اور وہ بے وقت اس طرح کے احکامات صادر نہ کرتے تو اس قسم کی صورتِ حال نہ دیکھنے کو ملتی اور پاکستانی کی حیثیت یہ نہ ہوتی۔

ویسے اس ناول کا زیادہ تر حصہ پاکستان اور ہندوستان کے بننے کے دوران ہونے والے فسادات اور ہجرت کرتے ہوئے قتل یا شہید ہونے والے افراد کی کہانی پر مشتمل ہے جن میں چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

> ''پگ بند جوانوں کے ہاتھ ایک لمحے کے لیے رک گئے۔ میں سفید بالوں والا ایک بزرگ ہندو ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ وہ خزاں کے زرد پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ اس نے کہا ''بچو! ہم تین دن کے پیاسے ہیں۔ ہمیں ایک گھونٹ پانی پلا دو، پھر بات سنو۔''
>
> ''مت سنو مت سنو اس کی بات۔ ہجوم چیخا۔ تم سب نیچے اُترو۔
>
> ''اُترو اُترو نیچے اُترو'' سب بولنے لگے
>
> ''بکتا ہے۔ بکواس کرتا ہے کافر کا بچہ'' آواز آئی۔
>
> ''میری پرارتھنا ہے کہ ہمیں مسلمان کر لو۔ کلمہ شریف تو مجھے پہلے سے ہی آتا ہے۔۔۔۔ لا الہ الا اللہ۔۔۔۔۔''
>
> نیچے اترو سور کے بچے۔۔۔ ہمیں دھوکہ دیتا ہے۔ کلمہ شریف مت پڑھنا اپنے پلید منہ سے۔۔۔''
>
> ہندو بزرگ ہاتھ جوڑے ہوئے نیچے اُتر آیا۔ پیچھے پیچھے اس کے تین جوان بیٹے۔ تین جوان بہوئیں، تین بچے اور ایک بڑھیا جس نے سفید کھدر کی ساڑی پہن رکھی تھی۔ بزرگ ہندو سب کے آگے کھڑا ہو گیا اور نہایت

عاجزی سے کہنے لگا۔ ''مہاراج ہم تو دل میں پہلے ہی سے مسلمان ہیں۔ ہمیں مسجد شریف میں لے چلو۔ ہمیں نماز سکھادو۔۔۔ لا الہ ال۔۔۔۔ آہ۔''

وہ اللہ نہ کہہ سکا۔ کسی نے اس کے سینے میں بلم بھونک دی تھی۔ اس کے منہ سے اللہ کی بجائے ایک چھوٹی سی آہ نکلی۔۔۔۔ ہاہ!

پگ بند نوجوان نے بلم کھینچ کر اس کے سینے سے نکالی۔ پھر کلہاڑیاں اس کے بچوں کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے لگے۔ آخر میں انہوں نے بڑھیا کو مارا۔ وہ کسی کام کی نہ تھی اور اسے زندہ چھوڑنا بھی بے وقوفی کی بات تھی کیونکہ اس کا اب کوئی ٹھکانا نہ تھا۔''(۹)

اس واقعے میں ہمیں مذہب کے نام پر اندھی دنیا کے خود غرض اور فسادی دکھائی دیتے ہیں جنہوں نے بے گناہ معصوم انسانوں کا بے رحمی سے صفایا کیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ اس دوران میں نوجوانوں نے اپنی جنسی تسکین کرنے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ منٹو نے جو لکھا تھا وہ بالکل درست ثابت ہوا۔ کئی جگہوں پر احمد بشیر نے منٹو کے افسانوں سے بڑھ کر واقعات کا ذکر کیا ہے جس سے جنسی درندگی کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''آپس میں قاتلوں نے کوئی جھگڑا نہ کیا، جس نے جس صندوق پر ہاتھ رکھا، اس کا ہوا۔ جو عورت جس کے ہاتھ لگی اس نے لے لی، وہاں سب کے لیے سب کچھ تھا۔ جوان لڑکیوں کو کسی نے کچھ نہ کہا۔ پگ بند نوجوان انہیں گھسیٹتے ہوئے لے چلے۔ ان بیچاریوں میں مدافعت کی طاقت نہ تھی۔ ان کو پتہ بھی نہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ ان کی ماں، باپ، بہن بھائی ان کی آنکھوں کے سامنے کاٹے گئے تھے۔ ان کے شیر خوار بچوں کی گردنیں اُڑائی گئی تھیں۔ انہوں نے کسی سے احتجاج نہ کیا وہ روئی بھی نہیں۔ وہ چابی والی پتلیوں کی طرح چپ چاپ چلتی رہیں۔''(۱۰)

تاجر وِ زمینداروں اور افسروں نے منصوبے بنائے تھے اور اب صرف وہی خالی ہاتھ نظر آتے تھے۔ جنہوں نے ہمت مرداں سے کام نہ لیا تھا جن کے باپ دادا نے اپنی نالائقی اور کاہلی کی وجہ سے ہندوستان میں کوئی جائیداد نہ چھوڑی تھی

یا جو کسی جائیداد کے اصلی یا جعلی کاغذات تیار نہ کروا سکے تھے۔ ایسے لوگ ملک پر بوجھ ہوتے ہیں۔ حکومتِ پاکستان سب کو آباد کرنا چاہتی تھی اور اس نے ہر بے وطن کو جو افسروں تک پہنچ سکا تھا۔ وہ مکان الاٹ کر دیا جس پر اس نے ہاتھ رکھا۔ جائیداد اتنی آسانی سے بٹتی دیکھ کر لوگ سارے غم بھول گئے اور رشوت اور جھوٹ کے ذریعے حصولِ دولت کا کلچر پھیل گیا۔ یہی سے پاکستان میں لوٹ مار کی ابتدا ہوئی جو ہر شعبے میں جاری و ساری تھی۔ قائدِ اعظم کو کچھ پتہ نہ تھا کہ نیچے کیا ہو رہا ہے، خزانہ خالی تھا، ٹیکس ملتے نہ تھے، کاروبار بند تھے۔ پنجاب اور بنگال کو مذہبی بنیاد پرستوں نے تقسیم اور تبادلہ آبادی نے ان کی کمر توڑ دی تھی۔ مہاجرین کی آبادکاری کے سوا انہیں کسی بات کا ہوس نہ تھا۔(۱۱)

احمد بشیر کے مذکورہ بالا تبصرے کو اور بے رحم صاف گوئی کو دیکھ کر تو یوں لگتا ہے کہ وہ آج اس ملک میں موجود ہے اور بول رہے ہیں۔ کیونکہ اب تک تاریخ ضرور بدلتے ہیں لیکن حالات اور حکومتی نظام ابھی تک وہی ہیں۔ جن کے حوالے سے احمد بشیر نے کھل کر بات کی ہے۔

اس دوران کشمیر میں وہ اپنی پوپھی کا قصہ بیان کرتے ہیں کہ وہاں مہاراج نے مسلمانوں کو محفوظ اور حکومتی سرپرستی میں پاکستان پہنچانے کے لیے تیس بسوں کا انتظام کر لیا تھا اور راستے میں ڈرائیور نے گاڑی جنگل میں داخل کر کے وہاں غنڈوں کے درمیان کھڑی کی جس کی وجہ سے وہاں تمام مسلمانوں کا جو بسوں میں موجود تھے ہندوؤں نے صفایا کر لیا تھا اور ان کے تمام تر پیسوں اور زیورات کو چھین کر لاشوں کو جنگلی جانوروں اور کتوں کے حوالے کر کے چلے گئے۔ ان میں سے بعض عورتیں اور مرد جو اس وقت بے ہوش ہو گئے تھے اور ان کو بعد میں ہوش آیا تھا۔ انہوں نے کن دشواریوں سے خود کو بچا لیا اور راستے میں اپنے زندہ بچوں کو اپنے ہاتھوں سے پھینک کر آئے۔ کس طرح اپنے وجود کے اعضا کو راستوں میں پھینک کر آئے، یہ سب کچھ اس آپ بیتی کا حصہ ہیں۔

اس آپ بیتی میں قدرت اللہ شہاب کو قدرت اللہ، ممتاز مفتی کو محض مفتی، قائد اعظم کو اصلی نام سے ابن انشا کو بیدل صحرائی کے ناموں سے یاد کیا ہے۔ اس طرح چراغ حسن، سید سبط حسن، میرا جی، کرشن چندر، سجاد ظہیر کو سید صاحب اور فیض صاحب کو تو انہوں نے معاف ہی کر لیا ہے لیکن اشفاق احمد کا کردار ادبی پردے میں خائف ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو احمد بشیر نہایت بے باک، صاف گو اور بے رحم حقیقت نگار ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ احمد بشیر کو اچھوں کو اچھا کہنا بھی آتا ہے اور اچھوں کو برا کہنا بھی اس لیے اچھے اچھے اس سے خوف زدہ رہتے ہیں اور یہی کہتے ہیں کہ نہ اس کی دوستی اچھی نہ اس کی دشمنی اچھی۔(۱۲) اس نظریے کے مطابق انہوں نے تقسیمِ ہند کے

دوران مسلمانوں اور ہندوں سمیت سکھوں کی بربریت اور باقی تمام لوگوں کے واقعات کھل کر بیان کیے جو تاریخ کا ایک بھیانک باب ہے۔

حوالہ جات

1. جواہر لال نہرو، تلاش ہند، تخلیقات، لاہور، طبع اول ۱۹۹۲۔ ص۔ ۶۴
2. احمد بشیر، دل بھٹکے گا، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء ص ۳
3. ایضاً، ص ۳
4. اشرف کمال، ڈاکٹر، اردو میں آپ بیتی کی روایت، سٹی بک ٹائم، کراچی، ۲۰۲۳ء، ص ۲۶
5. احمد بشیر، دل بھٹکے گا، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء ص ۷۸
6. ایضاً، ص ۹۸
7. ایضاً، ص ۱۵۰
8. پرویز پروازی، پروفیسر، ڈاکٹر، پس نوشت اور پسِ پس نوشت، نیازمانہ پبلشرز لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۲۶۸
9. احمد بشیر، دل بھٹکے گا، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء ص ۳۲۲
10. ایضاً، ص ۳۲۰
11. ایضاً، ص ۳۵۹
12. پرویز پروازی، پروفیسر، ڈاکٹر، پس نوشت اور پسِ پس نوشت، نیازمانہ پبلشرز لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۲۶۹